اکائی 11 پوس کی رات (پریم چند) متن کی تدریس

ساخت

11.1 اغراض ومقاصد

11.2 تمہید

11.3 پوس کی رات (پریم چند) متن کی تدریس

11.3.1 پریم چند: تعارف وافسانہ نگاری

11.3.2 پوس کی رات (متن)

11.3.3 پوس کی رات کا تجزیاتی مطالعہ

11.4 آپ نے کیا سیکھا

11.5 اپنا امتحان خود لیجیے

11.6 سوالات کے جوابات

11.7 فرہنگ

11.8 کتب برائے مطالعہ

11.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ

- پریم چند کی کہانی 'پوس کی رات' کا مطالعہ کرسکیں گے
- پریم چند کی افسانہ نگاری کے بارے میں جان سکیں گے
- پوس کی رات کے کرداروں سے متعارف ہوں گے
- پوس کی رات کے موضوع اور اس میں پیش کردہ مسائل سے آگاہ ہوسکیں گے

11.2 تمہید

اردو زبان میں افسانہ نگاری کی تاریخ ایک صدی سے زیادہ پرانی ہے۔ بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں شروع ہونے والا قصہ اب اکیسویں صدی کی دو دہائیاں گزار چکا ہے۔ اس دورانیے میں جن افسانہ نگاروں نے شہرت کی بلندیاں حاصل کیں اور فن افسانہ نگاری میں خاص مرتبے کو پہنچے ان میں نمایاں ترین نام پریم چند کا ہے۔ اردو کہانی کا کوئی بھی تذکرہ پریم چند کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا ہے۔ انھوں نے اردو زبان وادب کو بے شمار بہترین کہانیاں دیں اور اپنے بعد آنے والی کئی نسلوں کو متاثر کیا۔ ان کا طرز تحریر بعد میں آنے والی نسلوں میں دیکھا جاسکتا ہے۔ حقیقت پسندی اور ارضیت سے گہری وابستگی پریم چند کے افسانوں کی خاص شناخت ٹھہری ہے اور قصہ گوئی ان کے فن کا دلچسپ عنصر۔ ان کے پہلے افسانوی مجموعے ''سوز وطن'' سے لے کر آخری دور کے

مجموعوں ''واردات'' اور ''زادراہ'' کے افسانوں میں پریم چند کی ذہنی، فکری اور فنی ارتقا کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ ان مجموعوں میں ان کے کئی شاہکار محفوظ ہیں اور ایسا ہی ایک افسانہ ''پوس کی رات'' بھی ہے جسے ناقدین علم و ادب نے پریم چند کے ہی نہیں بلکہ اردو کے چند بہترین افسانوں میں شمار کیا ہے۔ اس سبق میں ہم پریم چند کا یہ افسانہ پڑھیں گے اور اس کی معنیاتی اور فکری دنیا کی سیر کریں گے۔

11.3 پوس کی رات (پریم چند) متن کی تدریس

11.3.1 پریم چند: تعارف و افسانہ نگاری

اس سے پہلے کہ ہم پوس کی رات کا متن پڑھیں مناسب ہے کہ پہلے پریم چند اور ان کی افسانہ نگاری سے متعلق چند ضروری باتیں جان لیں۔ تاکہ تفہیم متن میں مزید آسانی ہو سکے۔

پریم چند کا اصل نام دھنپت رائے تھا۔ گھر والے نواب رائے کے نام سے بھی پکارتے تھے۔ 31 جولائی 1880 کو اتر پردیش کے ایک چھوٹے سے گاؤں لمہی میں پیدا ہوئے۔ یہ گاؤں مردم خیز شہر بنارس سے چار پانچ میل دوری پر آباد ہے۔ منشی پریم چند کے والد کا نام منشی عجائب لال تھا جو ڈاک خانے میں ملازم تھے۔ پریم چند نے ابتدائی تعلیم گاؤں میں ہی مکمل کی۔ تعلیم کے شوق نے اردو اور فارسی پڑھنے کی جانب راغب کیا۔ 1889 میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ گھر کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ایک اسکول میں 18 روپے ماہوار پر ملازمت کر لی۔ 1904 میں الہ آباد ٹریننگ اسکول سے تدریس کی سند حاصل کی اور اس کے ایک سال بعد ہی کانپور کے ایک سرکاری اسکول میں ملازم ہو گئے۔ ادب سے منشی پریم چند کی دلچسپی کم عمری میں ہی شروع ہو گئی تھی۔ دراصل ان کی والدہ کے وفات کے بعد اور گھر میں نئی سوتیلی ماں کے آنے کے بعد گھر کا ماحول پہلے جیسا نہ رہا تو پریم چند کتابوں میں عافیت تلاش کرنے کی غرض سے سرشار، شرر اور رسوا کے علاوہ طلسم ہوش ربا اور جارج رینالڈس کے ناولوں کا مطالعہ کرنے لگے۔ لیکن کانپور میں ملازمت کے بعد ان کے ادبی سفر کو ایک بہترین آغاز ملا۔ مشہور رسالہ 'زمانہ' کے مدیر منشی دیا نرائن نگم سے ان کی ملاقات نے ان کے ذوق ادب کو مہمیز دی۔ 1908 میں پریم چند سب انسپکٹر مدارس مقرر ہوئے اور مہوبہ، بستی ہوتے ہوئے 1918 میں گورکھپور پہنچے۔ یہاں پہنچ کر انھوں نے انگریزی ادب، فارسی اور تاریخ کے مضامین کے ساتھ گریجویشن کی تعلیم مکمل کی۔ پریم چند کی زندگی بہت سی مشکلات کے بعد سنبھل چکی تھی اور معاشی طور پر بہتر ہو چکی تھی۔ مگر گورکھپور آنے کے بعد گاندھی جی ایک تقریر سے اثر لے کر انھوں نے اپنی بیس سالہ نوکری کو خیر آباد کہا اور پھر مفلسی کا شکار ہو گئے۔ اپنی معاشی بدحالی کو دور کرنے کے لیے انھوں نے مختلف کام کیے، چرخوں کی دکان کھولی، پرائیویٹ اسکول میں نوکری کی، سرسوتی پریس لگایا، نول کشور میں ملازمت کی، ہندی رسالہ 'مادھوری' کی ادارت کا ذمہ سنبھالا اور ہندی / اردو رسالہ 'ہنس' نکالا، فلمی دنیا میں قدم رکھا اور 'مزدور' فلم لکھی اور فلمی دنیا کے طور طریقے سے نالاں ہو کر بنارس لوٹ آئے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین نے 1936 میں انھیں اپنا صدر منتخب کیا تاہم پریم چند آخر عمر تک تنگدستی پر قابو نہ

پاسکے۔ مسلسل علالت کے سبب 8 اکتوبر 1936 کو ان کا انتقال ہوگیا۔

پریم چند نے دو شادیاں کی تھی۔ پہلی شادی ان کی مرضی کے خلاف کم عمری میں ہی کر دی گئی تھی جس سے ان کا نباہ نہ ہوسکا اور پھر بعد میں انھوں نے ایک نوعمر بیوہ خاتون شیورانی دیوی سے شادی کر لی۔ ان کی بیٹی کملا اور بیٹے شری پت رائے اور امرت رائے، شیورانی دیوی کے بطن سے پیدا ہوئے۔

پریم چند کی ادبی زندگی کم و بیش 35 برسوں پر محیط ہے۔ اس دوران انھوں نے جو کامیابی حاصل کی وہ کم ہی ادیبوں کو نصیب ہوتی ہے۔ ناول نگاری اور افسانہ نگاری کے میدان میں وہ اردو اور ہندی دونوں زبانوں کے بڑے تخلیق کار تسلیم کیے گئے ہیں۔ اسرار معابد، جلوۂ ایثار، ہم خرما و ہم ثواب، بازار حسن، گوشۂ عافیت، نرملا، چوگان ہستی، غبن، میدان عمل اور گئودان ان کے ناولوں میں شامل ہیں جبکہ افسانے کے کئی مجموعے ان کی یادگار ہیں۔ 'دنیا کا سب سے انمول رتن' کو ان کا پہلا افسانہ قرار دیا جاتا ہے جس کی اشاعت 1907 میں ہوئی۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ سوز وطن (1908) میں شائع ہوا۔ یہ مجموعہ نواب رائے کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد پریم پچیسی اول (1915)، پریم پچیسی دوم (1918)، پریم بتیسی (1920)، خاک پروانہ (1920)، خواب و خیال (1928)، فردوس خیال (1929)، پریم چالیسی (1930)، آخری تحفہ (1934) اور زاد راہ (1936) منظر عام پر آئے۔ دودھ کی قیمت (1937) اور واردات (1937) بھی پریم چند کے افسانوی مجموعے ہیں۔ پریم چند نے اردو میں کم و بیش دو سو کہانیاں تحریر کیں۔ بہت سی کہانیاں ہندی سے اردو میں منتقل ہونے سے رہ گئیں۔

پریم چند کی کہانیوں کو داستانوی رنگ، حب الوطنی کے جذبات اور حقیقت پسندی و حقیقت بیانی جیسی خوبیوں کا مرکب کہا جاتا رہا ہے۔ ان کی ابتدائی کہانیوں میں جہاں حب الوطنی کے جذبات اور داستانوی رنگ نظر آتا ہے وہیں بعد کی کہانیوں میں حقیقت پسندی کا وہ تیور نظر آتا ہے جس میں سماج، زندگی اور کائنات کی بنیادی سچائیاں سانس لیتی ہیں۔ دراصل پریم چند نے جس وقت اپنا ادبی سفر شروع کیا اس وقت فکشن کی دنیا فرضی داستانوں اور طلسمی کہانیوں کی شکل میں آباد تھی۔ پریم چند نے اس عام روش سے ہٹ کر ایک نئی راہ کا انتخاب کیا اور سماج و معاشرے نیز اس میں زیست کرنے والے افراد کو موضوع بنایا اور ایسی کہانیاں خلق کیں جن میں اس عہد کا معاشرہ، افراد، مسائل اور ماحول کو برہنہ دیکھا جاسکتا ہے۔ دیہی علاقوں کے بنیادی حقائق و مسائل کو جس طرح پریم چند نے ادبی اوراق میں محفوظ کر دیا ہے کسی اور جگہ ملنا مشکل ہے۔ خود پریم چند نے ہی کہا تھا کہ ہمیں حسن کا معیار بدلنا ہوگا اور انھوں نے اپنی کہانیوں میں حسن کا معیار بدل کر دکھایا بھی تھا۔ ان کی کہانی میں اب شہزادوں کی جگہ کھیتوں میں کام کرنے والے مزدوروں نے لے لی تھی۔ ان کے ماحول میں عطر دان کی خوشبو نہیں محنت کش کے پسینے مہکنے لگے تھے۔ یہ ہماری ادبی روایت میں بڑی تبدیلی تھی جس کے لیے اردو ادب پریم چند کا احسان مند رہے گا۔ مجنوں گورکھپوری نے پریم چند کے متعلق بجا لکھا ہے:

''پریم چند ان افسانہ نگاروں میں ہیں جن کا معترف شبلی جیسا انشا پرداز رہ چکا ہے۔ پریم چند فطرت کی طرف سے فسانہ نگاری کا فن لے کر آئے ہیں۔ انہوں نے اپنا موضوع ہندوستان کے طبقہ عوام کو رکھا ہے جن میں زیادہ تر دیہاتی معاشرت کے نمونے ہوتے ہیں۔ وہ جس زندگی کا مرقع پیش کرتے ہیں اس کو ہم روز اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہتے ہیں۔ ..... پریم چند کبھی مکمل زندگی کا نقشہ نہیں پیش کرتے ، ان کے افسانوں کے اجزائے ترکیبی چند چھوٹے چھوٹے مگر دلکش اور بصیرت افروز واقعات ہوتے ہیں۔ پریم چند کا مطمح نظر بڑی حد تک خارجی یا تمثیلی ہوتا ہے، ان کے افراد قصہ اپنے حرکات و سکنات اور بات چیت سے خود اپنے کردار پر روشنی ڈالتے ہیں۔.....ان کے مزاح میں ایک انفرادی خصوصیت ہوتی ہے جو کسی دوسرے افسانہ نگار میں نہیں پائی جاتی۔ .... پریم چند کا اسلوب بیان ان کا اپنا ہے جو نہایت سادہ، بے تکلف مگر دل پذیر ہوتا ہے۔''

مجنوں گورکھپوری، افسانہ، ایوان اشاعت، گورکھپور، 1935، ص129-128

11.3.2 پوس کی رات (متن)

(1)

ہلکو نے آ کر اپنی بیوی سے کہا، ''شہنا آیا ہے لاؤ جو روپے رکھے ہیں اسے دیدو کسی طرح گردن تو چھوٹے۔''

منی بہو جھاڑو لگا رہی تھی۔ پیچھے پھر کر بولی، ''تین ہی تو روپے ہیں دیدوں، تو کمبل کہاں سے آئے گا۔ ماگھ پوس کی رات کھیت میں کیسے کٹے گی۔ اس سے کہہ دو فصل پر روپے دیں گے۔ ابھی نہیں ہے۔''

ہلکو تھوڑی دیر تک چپ کھڑا رہا۔ اور اپنے دل میں سوچتا رہا پوس سر پر آ گیا ہے۔ بغیر کمبل کے کھیت میں رات کو وہ کسی طرح سو نہیں سکتا۔ مگر شہنا مانے گا نہیں، گھڑکیاں دے گا۔ یہ سوچتا ہوا وہ اپنا بھاری جسم لیے ہوئے (جو اس کے نام کو غلط ثابت کر رہا تھا) اپنی بیوی کے پاس گیا۔ اور خوشامد کر کے بولا۔ ''لا دیدے، گردن تو کسی طرح سے بچے، کمبل کے لیے کوئی دوسری تدبیر سوچوں گا۔''

منی اس کے پاس سے دور ہٹ گئی۔ اور آنکھیں ٹیڑھی کرتی ہوئی بولی، ''کر چکے دوسری تدبیر۔ ذرا سنوں کون تدبیر کرو گے؟ کون کمبل خیرات میں دیدے گا۔ نہ جانے کتنا روپیہ باقی ہے جو کسی طرح ادا ہی نہیں ہوتا۔ میں کہتی ہوں تم کھیتی کیوں نہیں چھوڑ دیتے۔ مر مر کر کام کرو۔ پیداوار ہو تو اس سے قرضہ ادا کرو چلو چھٹی ہوئی، قرضہ ادا کرنے کے لیے تو ہم پیدا ہی ہوئے ہیں۔ ایسی کھیتی سے باز آئے۔ میں روپے نہ دوں گی، نہ دوں گی۔''

ہلکو رنجیدہ ہو کر بولا، ''تو کیا گالیاں کھاؤں۔''

منی نے کہا، ''گالی کیوں دے گا؟ کیا اس کا راج ہے؟'' مگر یہ کہنے کے ساتھ ہی اس کی تنی ہوئی بھویں ڈھیلی پڑ گئیں۔ ہلکو کی بات میں جو دل دہلا دینے والی صداقت تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس کی جانب ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ اس نے طاق پر سے روپے اٹھائے اور لا کر ہلکو کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ پھر بولی، ''تم اب کی کھیتی چھوڑ دو۔ مزدوری میں سکھ سے ایک روٹی تو کھانے کو ملے گی۔ کسی کی دھونس تو نہ رہے گی۔ اچھی کھیتی ہے، مزدوری کر

کے لاؤ، وہ بھی اس میں جھونک دو۔اس پر سے دھونس۔''

ہلکو نے روپے لیے اور اسی طرح باہر چلا۔معلوم ہوتا تھا وہ اپنا کلیجہ نکال کر دینے جا رہا ہے۔اس نے ایک ایک پیسہ کاٹ کر تین روپے کمبل کے لیے جمع کیے تھے۔وہ آج نکلے جا رہے ہیں۔ایک ایک قدم کے ساتھ اس کا دماغ اپنی ناداری کے بوجھ سے دبا جا رہا تھا۔

(2)

پوس کی اندھیری رات۔آسمان پر تارے بھی ٹھٹھرتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ہلکو اپنے کھیت کے کنارے اوکھ کے پتوں کی ایک چھتری کے نیچے بانس کے کھٹولے پر اپنی پرانی گاڑھے کی چادر اوڑھے ہوئے کانپ رہا تھا۔ کھٹولے کے نیچے اس کا ساتھی کتا 'جبرا' پیٹ میں منھ ڈالے سردی سے کوں کوں کر رہا تھا۔دو میں سے ایک کو بھی نیند نہ آتی تھی۔

ہلکو نے گھٹنوں کو گردن میں چمٹاتے ہوئے کہا،''کیوں جبرا جاڑا لگتا ہے کہا تو تھا گھر میں پیال پر لیٹ رہ۔تو یہاں کیا لینے آیا تھا۔اب کھا سردی، میں کیا کروں۔جانتا تھا۔میں حلوہ پوری کھانے آ رہا ہوں۔دوڑتے ہوئے آگے چلے آئے۔اب روؤ اپنی نانی کے نام کو۔'' جبرا نے لیٹے ہوئے دم ہلائی اور ایک انگڑائی لے کر چپ ہو گیا شاید وہ یہ سمجھ گیا تھا کہ اس کی کوں، کوں کی آواز سے اس کے مالک کو نیند نہیں آ رہی ہے۔

ہلکو نے ہاتھ نکال کر جبرا کی ٹھنڈی پیٹھ سہلاتے ہوئے کہا،''کل سے میرے ساتھ نہ آنا نہیں تو ٹھنڈے ہو جاؤ گے۔یہ رانڈ پچھوا ہوا نہ جانے کہاں سے برف لیے آ رہی ہے۔اٹھوں پھر ایک چلم بھروں کسی طرح رات تو کٹے۔ آٹھ چلم تو پی چکا۔یہ کھیتی کا مزہ ہے اور ایک بھاگوان ایسے ہیں جن کے پاس اگر جاڑا جائے تو گرمی سے گھبرا کر بھاگے۔موٹے گدے لحاف کمبل مجال ہے کہ جاڑے کا گذر ہو جائے۔تقدیر کی خوبی ہے مزدوری ہم کریں۔مزہ دوسرے لوٹیں۔''

ہلکو اٹھا اور گڈھے میں ذرا سی آگ نکال کر چلم بھری۔جبرا بھی اٹھ بیٹھا۔ہلکو نے چلم پیتے ہوئے کہا،''پیئے گا چلم؟ جاڑا تو کیا جاتا ہے ہاں ذرا من بہل جاتا ہے۔''

جبرا نے اس کی جانب محبت بھری نگاہوں سے دیکھا۔ہلکو نے کہا۔''آج اور جاڑا کھالے۔کل سے میں یہاں پیال بچھا دوں گا۔اس میں گھس کر بیٹھنا جاڑا نہ لگے گا۔''

جبرا نے اگلے پنجے اس کے گھٹنوں پر رکھ دیے اور اس کے منھ کے پاس اپنا منھ لے گیا۔ہلکو کو اس کی گرم سانس لگی۔چلم پی کر ہلکو، پھر لیٹا۔اور یہ طے کر لیا کہ چاہے جو کچھ ہو اب کی سو جاؤں گا۔لیکن ایک لمحہ میں اس کا کلیجہ کانپنے لگا۔کبھی اس کروٹ لیٹا کبھی اس کروٹ۔جاڑا کسی بھوت کی مانند اس کی چھاتی کو دبائے ہوئے تھا۔

جب کسی طرح نہ رہا گیا تو اس نے جبرا کو دھیرے سے اٹھایا اور اس کے سر کو تھپ تھپا کر اسے اپنی گود میں سلا لیا۔ کتے کے جسم سے معلوم نہیں کیسی بدبو آ رہی تھی پر اسے اپنی گود سے چمٹاتے ہوئے ایسا سکھ معلوم ہوتا تھا جو ادھر مہینوں سے اسے نہ ملا تھا۔جبرا شاید یہ خیال کر رہا تھا کہ بہشت یہی ہے اور ہلکو کی روح اتنی پاک تھی کہ اسے کتے سے بالکل نفرت نہ تھی۔وہ اپنی غریبی سے پریشان تھا جس کی وجہ سے وہ اس حالت کو پہنچ گیا تھا۔ایسی انوکھی دوستی

نے اس کی روح کے سب دروازے کھول دیے تھے اس کا ایک ایک ذرہ حقیقی روشنی سے منور ہو گیا تھا۔ اسی اثنا میں جبرا نے کسی جانور کی آہٹ پائی اس کے مالک کی اس خاص روحانیت نے اس کے دل میں ایک جدید طاقت پیدا کر دی تھی جو ہوا کے ٹھنڈے جھونکوں کو بھی ناچیز سمجھ رہی تھی۔ وہ جھپٹ کر اٹھا اور چھپری سے باہر آ کر بھونکنے لگا۔ ہلکو نے اسے کئی مرتبہ پچکار کر بلایا پر وہ اس کے پاس نہ آیا کھیت میں چاروں طرف دوڑ دوڑ کر بھونکتا رہا۔ ایک لمحہ کے لیے آ بھی جاتا تو فوراً ہی پھر دوڑتا، فرض کی ادائیگی نے اسے بے چین کر رکھا تھا۔

(3)

ایک گھنٹہ گذر گیا سردی بڑھنے لگی۔ ہلکو اٹھ بیٹھا اور دونوں گھٹنوں کو چھاتی سے ملا کر سر کو چھپا لیا پھر بھی سردی کم نہ ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سارا خون منجمد ہو گیا ہے۔ اس نے اٹھ کر آسمان کی جانب دیکھا ابھی کتنی رات باقی ہے۔ وہ سات ستارے جو قطب کے گرد گھومتے ہیں۔ ابھی اپنا نصف دورہ بھی ختم نہیں کر چکے جب وہ اوپر آ جائیں گے تو کہیں سویرا ہوگا۔ ابھی ایک گھڑی سے زیادہ رات باقی ہے۔

ہلکو کے کھیت سے تھوڑی دیر کے فاصلہ پر ایک باغ تھا۔ پت جھڑ شروع ہو گئی تھی۔ باغ میں پتوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا ہلکو نے سوچا چل کر پتیاں بٹوروں اور ان کو جلا کر خوب تاپوں۔ رات کو کوئی مجھے پتیاں بٹورتے دیکھے تو سمجھے کہ کوئی بھوت ہے۔ کون جانے کوئی جانور ہی چھپا بیٹھا ہو۔ مگر اب تو بیٹھے نہیں رہا جاتا۔

اس نے پاس کے ارہر کے کھیت میں جا کر کئی پودے اکھاڑے اور اس کا ایک جھاڑو بنا کر ہاتھ میں سلگتا ہوا اپلہ لیے باغ کی طرف چلا۔ جبرا نے اسے جاتے دیکھا تو پاس آیا اور دم ہلانے لگا۔

ہلکو نے کہا اب تو نہیں رہا جاتا جبرو، چلو باغ میں پتیاں بٹور کر تاپیں، ٹاٹھے ہو جائیں گے تو پھر آ کر سوئیں گے۔ ابھی تو رات بہت ہے۔ جبرا نے کوں کوں کرتے ہوئے اپنے مالک کی رائے سے موافقت ظاہر کی اور آگے آگے باغ کی جانب چلا۔ باغ میں گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ درختوں سے شبنم کی بوندیں ٹپ ٹپ ٹپک رہی تھیں۔ یکا یک ایک جھونکا مہندی کے پھولوں کی خوشبو لیے ہوئے آیا۔

ہلکو نے کہا، ''کیسی اچھی مہک آئی جبرا۔ تمہاری ناک میں بھی کچھ خوشبو آ رہی ہے؟''

جبرا کو کہیں زمین پر ایک ہڈی پڑی مل گئی تھی۔ وہ اسے چوس رہا تھا۔

ہلکو نے آگ زمین پر رکھ دی اور پتیاں بٹورنے لگا۔ تھوڑی دیر میں پتوں کا ایک ڈھیر لگ گیا۔ ہاتھ ٹھٹھرتے جاتے تھے۔ ننگے پاؤں گلے جاتے تھے اور وہ پتیوں کا پہاڑ کھڑا کر رہا تھا۔ اسی الاؤ میں وہ سردی کو جلا کر خاک کر دے گا۔

تھوڑی دیر میں الاؤ جل اٹھا۔ اس کی لو اوپر والے درخت کی پتیوں کو چھو چھو کر بھاگنے لگی۔ اس متزلزل روشنی میں باغ کے عالی شان درخت ایسے معلوم ہوتے تھے کہ وہ اس لا انتہا اندھیرے کو اپنی گردن پر سنبھالے ہوں۔ تاریکی کے اس اتھاہ سمندر میں یہ روشنی ایک ناؤ کے مانند معلوم ہوتی تھی۔

ہلکو الاؤ کے سامنے بیٹھا ہوا آگ تاپ رہا تھا۔ ایک منٹ میں اس نے اپنی چادر بغل میں دبالی اور دونوں پاؤں پھیلا دیے۔ گویا وہ سردی کو للکار کر کہہ رہا تھا، ''تیرے جی میں آئے وہ کر۔'' سردی کی اس بے پایاں طاقت پر فتح پا

کر وہ خوشی کو چھپا نہ سکتا تھا۔

اس نے جبرا سے کہا، ''کیوں جبرا۔ اب تو ٹھنڈ نہیں لگ رہی ہے؟'' جبرا نے کوں کوں کر کے گویا کہا، اب کیا ٹھنڈ لگتی ہی رہے گی۔

''پہلے یہ تدبیر نہیں سوجھی نہیں تو اتنی ٹھنڈ کیوں کھاتے؟''

جبرا نے دم ہلائی۔

''اچھا آؤ، اس الاؤ کو کود کر پار کریں۔ دیکھیں کون نکل جاتا ہے اگر جل گئے بچہ تو میں دوا نہ کروں گا۔'' جبرا نے خوف زدہ نگاہوں سے الاؤ کی جانب دیکھا۔ ''منی سے کل یہ نہ جڑ دینا کہ رات ٹھنڈ لگی اور تاپ تاپ کر رات کاٹی۔ ورنہ لڑائی کرے گی۔'' یہ کہتا ہوا وہ اچھلا اور اس الاؤ کے اوپر سے صاف نکل گیا۔ پیروں میں ذرا سی لپٹ لگ گئی پر وہ کوئی بات نہ تھی۔ جبرا الاؤ کے گرد گھوم کر اس کے پاس کھڑا ہوا۔

ہلکو نے کہا چلو چلو، اس کی سہی نہیں۔ اوپر سے کود کر آؤ۔ وہ پھر کودا اور الاؤ کے اس پار آ گیا۔

(4)

پتیاں جل چکی تھیں۔ باغیچے میں پھر اندھیرا چھا گیا تھا۔ راکھ کے نیچے کچھ کچھ آگ باقی تھی۔ جو ہوا کا جھونکا آنے پر ذرا جاگ اٹھتی تھی پر ایک لمحہ میں پھر آنکھیں بند کر لیتی تھی۔

ہلکو نے پھر چادر اوڑھ لی اور گرم راکھ کے پاس بیٹھا ہوا ایک گیت گنگنانے لگا۔ اس کے جسم میں گرمی آ گئی تھی۔ پر جوں جوں سردی بڑھتی جاتی تھی اسے سستی دبا لیتی تھی۔

دفعتاً جبرا زور سے بھونک کر کھیت کی طرف بھاگا۔ ہلکو کو ایسا معلوم ہوا کہ جانور کا ایک غول اس کے کھیت میں آیا۔ شاید نیل گائے کا جھنڈ تھا۔ ان کے کودنے اور دوڑنے کی آوازیں صاف کان میں آ رہی تھیں۔ پھر ایسا معلوم ہوا کہ کھیت میں چر رہی ہیں۔ اس نے دل میں کہا۔ ہنہ، جبرا کے ہوتے ہوئے کوئی جانور کھیت میں نہیں آ سکتا۔ نوچ ہی ڈالے، مجھے وہم ہو رہا ہے۔ کہاں اب تو کچھ سنائی نہیں دیتا مجھے بھی کیسا دھوکا ہوا۔

اس نے زور سے آواز لگائی جبرا۔ جبرا۔

جبرا بھونکتا رہا۔ اس کے پاس نہ آیا۔

جانوروں کے چرنے کی آواز چر چر سنائی دینے لگی۔ ہلکو اب اپنے کو فریب نہ دے سکا مگر اسے اس وقت اپنی جگہ سے ہلنا زہر معلوم ہوتا تھا۔ کیسا گرمایا ہوا مزے سے بیٹھا ہوا تھا۔ اس جاڑے پالے میں کھیت میں جانا جانوروں کو بھگانا ان کا تعاقب کرنا اسے پہاڑ معلوم ہوتا تھا۔ اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ بیٹھے بیٹھے جانوروں کو بھگانے کے لیے چلانے لگا۔ لہولہو، ہو۔ ہو۔ ہاہا۔

مگر جبرا پھر بھونک اٹھا۔ اگر جانور بھاگ جاتے تو وہ اب تک لوٹ آیا ہوتا۔ نہیں بھاگے ابھی تک چر رہے ہیں۔ شاید وہ سب بھی سمجھ رہے ہیں کہ اس سردی میں کون بیٹھا ہے جو ان کے پیچھے دوڑے گا۔ فصل تیار ہے کیسی اچھی

کھیتی تھی۔ سارا گاؤں دیکھ دیکھ کر جلتا تھا اسے یہ ابھاگے تباہ کیے ڈالتے ہیں۔

اب ہلکو سے نہ رہا گیا وہ پکا ارادہ کر کے اٹھا اور دو تین قدم چلا۔ پھر یکا یک ہوا کا ایسا ٹھنڈا چبھنے والا، بچھو کے ڈنک کا سا جھونکا لگا وہ پھر بجھتے ہوئے الاؤ کے پاس آ بیٹھا اور راکھ کو کرید کرید کر اپنے ٹھنڈے جسم کو گرمانے لگا۔

جبرا اپنا گلا پھاڑے ڈالتا تھا۔ نیل گائیں کھیت کا صفایا کیے ڈالتی تھیں اور ہلکو گرم راکھ کے پاس بے حس بیٹھا ہوا تھا۔ افسردگی نے اسے چاروں طرف سے رسی کی طرح جکڑ رکھا تھا۔

آخر وہیں چادر اوڑھ کر سو گیا۔

سویرے جب اس کی نیند کھلی تو دیکھا چاروں طرف دھوپ پھیل گئی ہے۔ اور منی کھڑی کہہ رہی ہے۔ کیا آج سوتے ہی رہو گے تم یہاں میٹھی نیند سو رہے ہو اور ادھر سارا کھیت چوپٹ ہو گیا۔ سارا کھیت کا ستیاناس ہو گیا بھلا کوئی ایسا بھی سوتا ہے۔ تمہارے یہاں منڈیا ڈالنے سے کیا ہوا۔ ہلکو نے بات بنائی۔ میں مرتے مرتے بچا۔ تجھے اپنے کھیت کی پڑی ہے پیٹ میں ایسا درد اٹھا کہ میں ہی جانتا ہوں۔

دونوں پھر کھیت کے ڈانڈے پر آئے۔ دیکھا کھیت میں ایک پودے کا نام نہیں اور جبرا منڈیا کے نیچے چت پڑا ہے۔ گویا بدن میں جان نہیں ہے۔ دونوں کھیت کی طرف دیکھ رہے تھے۔ منی کے چہرہ پر اداسی چھائی ہوئی تھی۔ پر ہلکو خوش تھا۔

منی نے فکرمند ہو کر کہا، ''اب مجوری کر کے مال گجاری دینی پڑے گی۔''

ہلکو نے مستانہ انداز سے کہا، ''رات کو ٹھنڈ میں یہاں سونا تو نہ پڑے گا۔''

''میں اس کھیت کا لگان نہ دوں گی یہ کہے دیتی ہوں۔ جینے کے لیے کھیتی کرتے ہیں مرنے کے لیے نہیں کرتے۔''

''جبرا ابھی تک سویا ہوا ہے۔ اتنا تو کبھی نہ سوتا تھا۔''

''آج جا کر شہنا سے کہہ دے، کھیت جانور چر گئے ہم ایک پیسہ نہ دیں گے۔''

''رات بڑے گجب کی سردی تھی۔''

''میں کیا کہتی ہوں تم کیا سنتے ہو۔''

''تو گالی کھلانے کی بات کہہ رہی ہے۔ شہنا کو ان باتوں سے کیا سروکار، تمہارا کھیت چاہے جانور کھائیں چاہے آگ لگ جائے، چاہے اولے پڑ جائیں، اسے تو اپنی مال گجاری چاہیے۔''

''تو چھوڑ دو کھیتی، میں ایسی کھیتی سے باز آئی۔''

ہلکو نے مایوسانہ انداز سے کہا، ''جی من میں تو میرے بھی یہی آتا ہے کہ کھیتی باڑی چھوڑ دوں۔ منی تجھ سے سچ کہتا ہوں مگر مجوری کا کھیال کرتا ہوں تو جی گھبرا اٹھتا ہے۔ کسان کا بیٹا ہو کر اب مجوری نہ کروں گا، چاہے کتنی ہی درگت ہو جائے۔ کھیتی کا مرجاد نہ نہیں بگاڑوں گا۔ جبرا۔۔۔ جبرا۔۔۔ کیا سوتا ہی رہے گا۔ چل گھر چلیں۔''

11.3.3 پوس کی رات کا تجزیاتی مطالعہ

پریم چند کا افسانہ 'پوس کی رات' لکھنؤ کے ہندی ماہنامہ مادھوری میں مئی 1930 کے شمار میں شائع ہوا۔ اردو کے ان کے افسانوی مجموعے 'پریم چالیسی' (حصہ دوم) میں یہ افسانہ بھی شامل ہے۔

پریم چند نے اپنے اس افسانے میں دیہی زندگی، کسان کی مجبوری، مہاجن کے ظلم اور قدرت کے فیصلوں کو موضوع سخن بنایا ہے اور یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ دیہی خطے میں بسنے والا اور زندگی کی بنیادی سہولتوں سے محروم کسان کس طرح شب و روز کی محنت سے فصل اگاتا ہے اور پھر بھی خالی ہاتھ نیز قرض کے بوجھ تلے دبا رہتا ہے۔ آزادی سے قبل ہندوستانی کسانوں کی اس حالت کو پریم چند نے اپنے بہت سے افسانوں میں پیش کیا ہے۔ 'سوا سیر گیہوں' میں انھوں نے مہاجنوں اور ساہوکاروں کے استحصالی رویے کو پیش کیا ہے اور ناختم ہونے والے سودی سلسلے کی لعنت کو ہمارے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہاں سوا سیر گیہوں کا لگان کسان کی نسلیں چکاتی رہتی ہیں۔ پوس کی رات بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

بنیادی طور پر پوس کی رات منشی پریم چند کی لکھی ہوئی دل کو چھو لینے والی اور انتہائی حساس کہانی ہے۔ اس میں پریم چند نے اپنے ملک کے کسانوں کی حالت زار اور ان کے گزر بسر کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی غربت اور بنیادی وسائل کی کمی کو اس کہانی کے مرکزی کردار ہلکو کے ذریعے بہت ہی شائستہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ 'پوس کی رات' قرض کے بوجھ تلے دبے ایک ایسے کسان (ہلکو) کی کہانی ہے جو کڑاکے کی ٹھنڈ میں اپنے لیے برسوں سے بچت کر کر جمع کیے گئے تین روپیوں سے کمبل بھی خرید پانے کا اہل نہیں بن پاتا۔ سرد رات اور کسان کی بے بسی کا جو نقشہ پریم چند نے اس افسانے میں پیش کیا ہے وہ اس سماج کے گھناونے چہرے سے پردہ اٹھاتا ہے جس میں سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں کسان کسی کٹھ پتلی سے زیادہ کی حیثیت نہیں رکھتا ہے۔

'پوس کی رات' کہانی کا موضوع ایک کسان کا ذاتی المیہ ہے۔ البتہ کہانی کا مرکزی کردار ہلکو ضرور ہے مگر اس میں ملک کے تمام کسانوں کی غربت و افلاس کا سچ نظر آتا ہے۔ اس کہانی میں ایک پوری رات کا جو منظر نامہ پیش کیا گیا ہے وہ انتہائی متاثر کن ہے۔ جو لوگ آج بھی دیہی علاقوں میں رہتے ہیں وہ اس پچھوا ہوا سے واقف ہیں جو جب سرد راتوں میں چلتی ہے تو احساس ہوتا کہ ہڈیوں کو پگھلا کر پانی کر دے گی۔ پوس کی رات میں چلنے والی ان ہواؤں کا سامنا ان کسانوں کو زیادہ ہوتا ہے جو ہلکو کی طرح اپنی راتیں گھر کے باہر اپنے کھیتوں کی حفاظت میں گزارتے ہیں ہے۔

اس افسانے میں انسانی زندگی کا درد، پریشانیاں اور مجبوریاں ہیں۔ اس میں انسان اور جانور کے درمیان دوستی کی ایک مثالی تصویر دیکھنے کو ملتی ہے۔ اسی لیے تو ہلکو اپنے کتے جبرا سے کہتا ہے کہ تو خواہ مخواہ میرے پیچھے چلا آیا۔ کیا ضرورت تھی اس 'رانڈ پچھوا' ہوا کے قہر کو جھیلنے کی۔ گھر میں رہتا آرام سے سوتا۔ کل سے میرے ساتھ نہ آنا نہیں تو ٹھنڈا ہو جائے گا۔ ساتھ ہی وہ انسانی زندگی میں مقدر اور قسمت کی مار پر انتہائی اہم اور حقیقت حال کے مطابق تبصرہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

> ''یہ کھیتی کا مزہ ہے اور ایک بھاگوان ایسے ہیں جن کے پاس اگر جاڑا جائے تو گرمی سے گھبرا کر بھاگے۔ موٹے گدے لحاف کمبل مجال ہے کہ جاڑے کا گذر ہو جائے۔ تقدیر کی خوبی ہے مزدوری ہم کریں۔ مزہ دوسرے لوٹیں''

اس کہانی کے ذریعے پریم چند نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ہمارے کسان کس طرح مشکل حالات میں جی رہے ہیں۔ آخر وہ بھی انسان ہیں، غریب بے بس کسان قدرت کی سخت آفات کا سامنا نہیں کر پاتے اور نتیجتاً وہ

اپنا سب کچھ کھو بیٹھتے ہیں۔ جیسے کہ ہلکو سردی کا مقابلہ نہ کر سکا اور سو گیا اور آخر کار اس کے کھیتوں کو جانور چر گئے۔ اس افسانے میں پریم چند نے کسانوں کی زمینی خداؤں کے سامنے بے بسی اور فطرت سے نبرد آزمائی کو بھی دکھایا ہے۔ ایک طرف تو زمین پر وہ ساہوکاروں کے شکنجے میں جکڑے ہوتے ہیں دوسری طرف قدرت بھی ان کا امتحان لے رہی ہوتی ہے۔ ہڈیوں کو چھید دینے والی سرد رات میں اپنے فصل کی نگہبانی کے لیے ہلکو کا کھیت میں کھلے آسمان کے نیچے پھٹے پرانے کمبل کے ساتھ رات بسر کرنا فطرت کے ساتھ اس کی نبرد آزمائی کا استعارہ ہے۔ یہاں ہار جیت معنی نہیں رکھتی وہ جدوجہد بامعنی ہے جس کے پیچھے ایک مجبور کسان کی ہزاروں امیدیں کارفرما ہوتی ہیں۔ پریم چند نے اس پورے منظر میں انسانی سماج کی بے حسی کو بھی پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ شاید اسی سبب اس سخت ترین رات میں ہلکو کا ساتھ دینے کے لیے بس ایک کتا (جبرا) ہوتا ہے۔ کسان اور فطرت کے آپسی تعلق کے تناظر میں پوس کی رات کا مطالعہ کرنے کے بعد عظیم الشان صدیقی نے لکھا ہے:

> ''پوس کی رات میں پریم چند کا فن اپنی بلندیوں کو چھوتا ہوا نظر آتا ہے جہاں مقصد اور فن، حقیقت نگاری اور تخیل کی آمیزش نے افسانے کو شاہکار بنا دیا ہے۔ اور یہی ان کے شعور فن کا وہ پہلو بھی ہے جو بار بار پریم چند کے افسانوں میں یہ باور کرانے کی کوشش کرتا ہے کہ انسان اور قدرت کے درمیان یہ رشتے صرف آویزش، مقاومت اور تصادم ہی کے نہیں ہیں بلکہ ان میں سچی رفاقتوں، مصالحتوں اور مفاہمتوں کی خوشبو بھی رچی بسی ہوئی ہے۔ یہ پیڑ پودے، جنگل، پہاڑ، ندی نالے، ہرے بھرے میدان اور ریگستان، کھیت کھلیان، چرند پرند، چاند سورج، نیلا آسمان اور چمکتے تارے، اس کے رنگ بدلتے موسم، سونا جیسی زمین وغیرہ اس کے دشمن نہیں بلکہ ایسے دوست ہیں جن کے سہارے وہ زندگی کے نرم گرم دن گزارتا ہے اور جب تمام دنیا اس کی دشمن ہو جاتی ہے اس وقت بھی فطرت کا آغوش اسے پناہ دیتا ہے۔
>
> عظیم الشان صدیقی، افسانہ نگار پریم چند، تنقیدی و سماجی محاکمہ، 2006، ص 106

بلاشبہ یہ افسانہ کئی تناظر میں پریم چند کے نمائندہ افسانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ بعض ناقدین نے تو اسے 'کفن' سے بھی بڑا افسانہ کہا ہے۔ جیسا کہ مانک ٹالا نے 'کفن' اور 'پوس کی رات' کا تقابلی مطالعہ کرنے کے بعد لکھا ہے کہ 'پریم چند اور دیگر نقادوں کے قائم کیے ہوئے معیاروں پر پوس کی رات ہر جہت سے کامیاب کہانی ہے۔ اس کے برعکس کفن کافی کمزور کہانی ہے۔' ان کے آخری جملے پر بحث ضرور کی جا سکتی ہے البتہ پہلے جملے میں پیش کردہ سچائی ہر کسی کو تسلیم ہوگی۔ دراصل پوس کی رات میں پریم چند نے ہلکو کا جو مرکزی کردار پیش کیا ہے وہ مادھو اور گھیسو یا دوسرے کرداروں کی طرح بے حس، بے غیرت اور بے حیا نہیں ہے بلکہ اس کے اندر ایک قسم کی خودداری، تکلیف دہ اور مشکل حالات سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ اور عزت نفس کو عزیز رکھنے والی مثبت صفات موجود ہیں۔ شہنا کو جمع کیے ہوئے پیسے دینے کے سلسلے میں ہلکو اور اس کی بیوی کے درمیان ہونے والا مکالمہ اسی عزت نفس کو پیش کرتا ہے جس کی حفاظت کے لیے ہلکو گالی سننے کے بجائے سخت سردی برداشت کرنے کا حوصلہ دکھاتا ہے۔ خود ہلکو کی بیوی کی کھیتی باڑی سے بے زاری بھی اسی عزت نفس کے تناظر میں سامنے آتی ہے جسے بعد میں خوبصورتی سے

پریم چند نے اپنے اس اقتباس میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے:

منی نے کہا، ''گالی کیوں دے گا؟ کیا اس کا راج ہے؟'' مگر یہ کہنے کے ساتھ ہی اس کی تنی ہوئی بھویں ڈھیلی پڑ گئیں۔ ہلکو کی بات میں جو دل دہلا دینے والی صداقت تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس کی جانب ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ اس نے طاق پر سے روپے اٹھائے اور لا کر ہلکو کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ پھر بولی، ''تم اب کی کھیتی چھوڑ دو۔ مزدوری میں سکھ سے ایک روٹی تو کھانے کو ملے گی۔ کسی کی دھونس تو نہ رہے گی۔ اچھی کھیتی ہے، مزدوری کر کے لاؤ، وہ بھی اس میں جھونک دو۔ اس پر سے دھونس۔''

اس افسانے میں پریم چند نے اپنے کرداروں کے ذریعے یہ دکھانے کی بھی کوشش کی ہے کہ انسان اپنی ضرورتوں اور حالات سے صرف نگاہی کر کے بچ نہیں سکتا ہے۔ اسے بہر حال ان حالات کے خلاف کھڑا ہونا ہوتا ہے اور اپنی زندگی کے لیے ان پر فتح حاصل کرنی ہوتی ہے۔ شاید اسی سبب ہلکو مزدوری پر کھیتی کو ترجیح دیتا ہے:

''جی من میں تو میرے بھی یہی آتا ہے کہ کھیتی باڑی چھوڑ دوں۔ منی تجھ سے سچ کہتا ہوں مگر مجوری کا کھیال کرتا ہوں تو جی گھبرا اٹھتا ہے۔ کسان کا بیٹا ہو کر اب مجوری نہ کروں گا، چاہے کتنی ہی درگت ہو جائے۔ کھیتی کا مرجاد نہیں بگاڑوں گا۔''

پریم چند نے اس افسانے میں زندگی کے اس فلسفے کو بھی پیش کیا ہے کہ زندگی مسلسل محنت، شکست و فتح اور مشکلات و پریشانیوں سے نبرد آزمائی سے عبارت ہے۔ ساتھ ہی لگان اور ساہوکاری کے اس روپ کو بھی پیش کیا ہے جس میں سامنے والے کی پریشانیوں یا ضرورتوں سے ساہوکار کو کوئی سروکار نہیں ہوتا اور وہ بس اپنے قرض، لگان اور پیسے سے مطلب رکھتا ہے۔ اسی لیے کھیت جانوروں کے چر لینے کے بعد ہلکو کی بیوی مُنی کہتی ہے:

''میں اس کھیت کا لگان نہ دوں گی یہ کہے دیتی ہوں۔ جینے کے لیے کھیتی کرتے ہیں مرنے کے لیے نہیں کرتے۔... آج جا کر شہنا سے کہہ دے، کھیت جانور چر گئے ہم ایک پیسہ نہ دیں گے۔''

اس پر ہلکو جو جواب دیتا ہے وہ اس سنگ دل معاشرے کی قلعی کھولتا ہے جس نے صدیوں کسانوں، مجبوروں اور مزدوروں کا خون چوسا ہے۔ ہلکو کہتا ہے

''تو گالی کھلانے کی بات کہہ رہی ہے۔ شہنا کو ان باتوں سے کیا سروکار، تمہارا کھیت چاہے جانور کھائیں چاہے آگ لگ جائے، چاہے اولے پڑ جائیں، اسے تو اپنی مال گجاری چاہیے۔''

ہلکو زندگی کی اس حقیقت سے آشنا تھا شاید اسی لیے سارا کھیت تباہ ہونے کے بعد وہ 'مستانہ انداز' میں یہ کہنے کا حوصلہ رکھتا ہے کہ 'رات کو یہاں ٹھنڈ میں سونا تو نہیں پڑے گا'۔ ہلکو کے اس رویے پر اس کی بیوی پریشان ضرور ہوتی ہے مگر ہلکو مطمئن نظر آتا ہے۔ سوال یہ بھی اٹھتا ہے کہ کیا سچ مچ ہلکو نے سستی اور کاہلی میں اپنا کھیت نیل گایوں کے چرنے کے لیے چھوڑ دیے جبکہ اس کا کتا جبرا لگاتار بھونک کر اسے متنبہ کر رہا تھا اور خود وہ بھی ایک دو بار اٹھ کر دو چار قدم چلتا ہے مگر جبرا کے ہوتے ہوئے کوئی کچھ نہ بگاڑ سکے گا کے بھرم میں سرد ہواؤں سے بچنے کے لیے الاؤ

کے پاس لوٹ آتا ہے۔ شاید یہاں سستی اور کاہلی اصل وجہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کے پیچھے اصل وجہ یہ ہے کہ ہلکو قرض چکا چکا کر پریشان ہو چکا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ اس فصل کو کس کے لیے بچائے؟ اس مہاجن کے لیے؟ جس کے مسلسل استحصال نے ہلکو کو اپنی بہترین فصل سے بھی منہ پھیر لینے پر مجبور کر دیا تھا۔ اسی سبب تو اس نے سردی سے بچنے پر دھیان دیا۔ کیونکہ وہ اپنی زندگی اور حالات کی حقیقت سے واقف ہو چکا تھا۔

دیہی زندگی پر مشتمل پریم چند کی کہانیوں میں پوس کی رات کو انتہائی اہمیت حاصل ہے۔ اس کہانی کے پلاٹ کے ساتھ ساتھ اس کی زبان بہت عمدہ ہے۔ اس کہانی میں پریم چند نے جو مکالمے استعمال کیے ہیں وہ ان کرداروں کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اس کہانی کی زبان میں کہیں کوئی الجھاؤ نہیں ہے۔ بول چال کی آسان زبان استعمال ہوئی ہے۔ دیہی زندگی کی تصویر کشی کرتے ہوئے دیہی روزمرہ اور محاورے بھی استعمال میں آئے ہیں۔ پریم چند نے کہانی میں محض حقیقت بیانی پر توجہ مرکوز کی ہے۔ وہ اپنے کردار کو ہیرو یا ولن بنانے پر توجہ نہیں دیتے بلکہ ہمارے سامنے ایک ایسا شخص پیش کرتے ہیں جو مختلف حالات سے دوچار ہو رہا ہے اور انہیں حالات کے مطابق ردعمل کر رہا ہے۔ کہانی آغاز تا اختتام تک ایک تاثر رکھتی ہے جو افسانہ ختم ہونے کے ساتھ ساتھ قاری کے ذہن میں محفوظ ہو جاتا ہے۔

11.4 آپ نے کیا سیکھا

اس اکائی میں آپ

- پریم چند کے حالات زندگی سے واقف ہوئے
- پریم چند کی افسانہ نگاری کی خصوصیات سے واقف ہوئے
- 'پوس کی رات' کے متن کا مطالعہ کیا
- پریم چند کی اس اہم کہانی کے موضوعات و مسائل کے متعلق واقف ہوئے

11.5 اپنا امتحان خود لیجیے

1 پریم چند کے چند اہم افسانوی مجموعوں کے نام بتائیے۔

2 پریم چند کے افسانے 'پوس کی رات' کے مرکزی کرداروں کا نام بتائیے۔

3 'پوس کی رات' کے مرکزی خیال پر روشنی ڈالیے۔

4 'پوس کی رات' کے مرکزی کردار کی ذہنیت اور فکر کی وضاحت کیجیے۔

11.6 سوالات کے جوابات

1 ان کا پہلا افسانوی مجموعہ سوز وطن (1908) میں شائع ہوا۔ یہ مجموعہ نواب رائے کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد پریم پچیسی اول (1915)، پریم پچیسی دوم (1918)، پریم بتیسی (1920)، خاک پروانہ (1920)، خواب و خیال (1928)، فردوس خیال (1929)، پریم چالیسی (1930)،

آخری تحفہ (1934) اور زادراہ (1936) منظر عام پر آئے۔ دودھ کی قیمت (1937) اور واردات (1937) بھی پریم چند کے افسانوی مجموعے ہیں۔

2 'پوس کی رات' کے کرداروں میں ہلکو (کسان)، مُنی (ہلکو کی بیوی)، شہنا (ساہوکار) اور جبرا (ہلکو کا کتا) شامل ہیں۔

3 بنیادی طور پر پوس کی رات منشی پریم چند کی لکھی ہوئی دل کو چھو لینے والی اور انتہائی حساس کہانی ہے۔ اس میں پریم چند نے اپنے ملک کے کسانوں کی حالت زار اور ان کے گزر بسر کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی غربت اور بنیادی وسائل کی کمی کو اس کہانی کے مرکزی کردار ہلکو کے ذریعے بہت ہی شائستہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ 'پوس کی رات' قرض کے بوجھ تلے دبے ایک ایسے کسان (ہلکو) کی کہانی ہے جو کڑاکے کی ٹھنڈ میں اپنے لیے برسوں سے بچت کر کر جمع کیے گئے تین روپیوں سے کمبل بھی خرید پانے کا اہل نہیں بن پاتا۔

4 افسانے کا مرکزی کردار ہلکو ایک کسان ہے جو اپنی زندگی اور ماحول کے سارے بھیدوں سے واقف ہے اور جانتا ہے کہ ایک کسان کی عمر مزدوری اور کھیتی باڑی کرتے ہوئے بھی قرض کے بوجھ تلے ہی گزرنے والی ہے۔ شاید اسی سبب وہ اپنا سارا کھیت تباہ ہونے کے بعد 'مستانہ انداز' میں یہ کہنے کا حوصلہ رکھتا ہے کہ 'رات کو یہاں ٹھنڈ میں سونا تو نہیں پڑے گا۔ اس کے پیچھے اصل وجہ یہ ہے کہ ہلکو قرض چکا چکا کر پریشان ہو چکا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ اس فصل کو کس کے لیے بچائے؟ اس مہاجن کے لیے؟ جس کے مسلسل استحصال نے ہلکو کو اپنی بہترین فصل سے بھی منہ پھیر لینے پر مجبور کر دیا تھا۔ اسی سبب تو اس نے سردی سے بچنے پر دھیان دیا۔ کیونکہ وہ اپنی زندگی اور حالات کی حقیقت سے واقف ہو چکا تھا۔

11.7 فرہنگ

لفظ	معنی
مہمیز	تحریک، ترغیب
ادارت	اخبار یا رسالے کی نگرانی کا کام، مدیری، ایڈیٹری
بطن	پیٹ
معابد	معبد کی جمع، عبادت گاہیں
مرکب	مجموعہ، کئی چیزوں سے مل کر بنی ہوئی چیز
طلسمی	جادو کا، جادو سے بنا ہوا، طلسماتی
مرقع	لفظی تصویر
مطمح نظر	مرکز نگاہ، مقصود
حرکات وسکنات	نقل وحرکت، طور وطریق، عادات واطوار
بہشت	جنت

قطب	وہ ستارہ جو قطب شمالی کی طرف زمین کے محور کے سرے پر ہے اس لیے یہ حرکت کرتا ہوا معلوم نہیں ہوتا، قطب تارا
اپلہ	کنڈا، گوبر کا پاتھا ہوا ایندھن
متزلزل	ڈگمگانے والا، لرزاں
غول	جھنڈ
منڈیا	چھوٹی سی جھگی، چھپر یا تنبو
مال گجاری	(مال گزاری)، لگان
مرجاد	ریت، رسم
پچھوا	مغرب کی طرف سے چلنے والی ہوا، سردیوں میں اس کے چلنے پر سخت ٹھنڈک کا احساس ہوتا ہے

11.8 کتب برائے مطالعہ

-1	عظیم الشان صدیقی	افسانہ نگار پریم چند، تنقیدی و سماجی محاکمہ	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	2006
-2	ڈاکٹر جعفر رضا	پریم چند کہانی کار رہنما	رام نرائن لال بنی مادھو، الہ آباد	1969
-3	پرکاش چندر گپت	پریم چند	ساہتیہ اکیڈمی، دہلی	1976